سیر ملک اودھ

یوسف خان کمبل پوش کا دوسرا غیر مطبوعہ سفر نامہ

ڈاکٹر نجیبہ عارف
صدر شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

A TOUR OF AWADH

KAMBALPOSH'S SECOND UNPUBLISHED TRAVELOGUE

Najeeba Arif, PhD
Chairperson Department of Urdu
International Islamic University, Islamabad

Abstract

This paper introduces an unpublished text of a travelogue by Yousuf Khan Kambalposh, written in 1847. This manuscript remained unknown to the Urdu world until now and has been discovered for the first time by the author of the paper. The manuscript consists of 156 folios of 7.9*5.4 size and has been written in clear nasta'liq. This travelogue narrates the accounts of his visits to many cities, villages and areas around the city of Lucknow, the capital of the state of Awadh in the regime of the last Indian emperor of Awadh, Wajid Ali Shah. It is a very interesting narrative and gives first hand information about the socio-political conditions of the state of that critical period. This narrative is of great importance in terms of historical and linguistic records.

Keywords: کمبل پوش، سفر نامہ، حیدر آباد، ڈھاکہ، اکبر آباد، لکھنؤ، سید محسن علی، تاریخ یوسفی، مطبع منشی نول کشور، عجائبات فرنگ

'سیر ملک اودھ' یوسف خان کمبل پوش کا دوسرا سفرنامہ ہے جو ریاست اودھ کے مختلف علاقوں اور اس کے گرد و نواح کے سفر کے حالات و واقعات کے بیان پر مبنی ہے۔ اس سفرنامے کا قلمی نسخہ بودلین لائبریری، اوکسفرڈ میں موجود ہے، جو دستیاب معلومات کے مطابق منحصر بہ فرد خطی نسخہ ہے۔ نسخے میں مصنف کی ایک رنگین روغنی تصویر بھی ہے جس میں مصنف کے چہرے پر گھنی سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں ہیں اور سر پر پگڑی ہے۔ یہ تصویر اس سے پہلے کسی اور کتاب میں شائع نہیں ہوئی۔ اس نسخے کا اندراج بودلین لائبریری کی کسی فہرست میں نہیں۔ نسخے کے آغاز میں درج ذیل تعارفی کلمات درج ہیں:

Travels in Oudh and the Deccan in AH 1263. A Continuation of Ajaibat-i Farang or Travels in Europe.

یہ خطی نسخہ بودلین لائبریری میں انڈین انسٹی ٹیوٹ، اوکسفرڈ کے ذخیرے کا حصہ ہے اور انڈین انسٹی ٹیوٹ کو یہ مخطوطہ رابرٹ کیتھ پرنگل (۱) نے ۷ فروری، ۱۸۷۹ء کو پیش کیا تھا۔ یہ مجلد قلمی نسخہ ۱۵۶ اوراق پر مشتمل ہے اس کا رنگ پیلا اور حالت خستہ ہے لیکن تحریر خوب روشن اور واضح ہے۔ مسطر کا سائز ۹.۷ × ۵.۴ ہے۔ پہلے اور آخری صفحے کو چھوڑ کر ہر صفحے پر نو سطریں ہیں۔ خط نستعلیق میں موٹے قط کے قلم سے لکھے گئے اس نسخے پر کاتب کا نام درج نہیں اور نہ ہی کوئی عنوان دیا گیا ہے۔ 'سیر ملکِ اودھ' کا عنوان راقم الحروف نے سفرنامے کے ایک اقتباس سے اخذ کیا ہے۔ اس تصنیف میں ایک سے زیادہ مقامات پر مصنف نے اپنے سفر یورپ اور سفرنامے کا ذکر کیا ہے، جس کا حوالہ بعد میں دیا گیا ہے۔ تاہم اس سفرنامے کے مندرجات کا مفصل جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے مصنف کی زندگی اور عہد پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

یوسف خان کمبل پوش اردو میں یورپ کے پہلے سفرنامہ نگار کے طور پر معروف ہیں۔ ان کا پہلا سفرنامہ 'تاریخ یوسفی' (۱۸۴۷ء) ایک مدت تک 'عجائباتِ فرنگ' کے عنوان سے شائع ہوتا رہا ہے۔ (۲) یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۸۴۷ء میں دہلی کالج کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ دوسری اشاعت منشی نول کشور کے مطبع سے ۱۸۷۳ء میں ہوئی اور اس اشاعت میں ناشر نے سفرنامے کا عنوان تبدیل کر کے 'عجائباتِ فرنگ' رکھ دیا۔ پہلی اشاعت کا کوئی نسخہ تا دیر دستیاب نہ ہونے کے باعث دیگر تمام اشاعتیں،

اسی دوسری اشاعت کی بنیاد پر ہوتی رہیں اور یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۴ء تک یہ کتاب 'عجائباتِ فرنگ' کے نام سے ہی پہچانی جاتی رہی۔ ۲۰۰۴ء میں اکرام چغتائی نے اس کی پہلی اشاعت کا عکس حاصل کر کے اسے نئے سرے سے مرتب کیا تو اس کا اصل نام 'تاریخِ یوسفی' منظرِ عام پر آیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی گئی تھی، لیکن طباعت سے پہلے ہی مصنف نے خود اسے اردو میں ڈھال دیا تھا۔(۳)

پاک و ہند اور مغربی ممالک کے کئی محققین نے کمبل پوش کے اس سفرنامے کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے اور اس کے مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر یورپ اور ہندوستان کے معاشرتی و سماجی روابط پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔(۴) مگر یوسف خان کے بارے میں ان کی تحقیق کا ماخذ خود ان کی اپنی تحریر یعنی تاریخِ یوسفی کے وہ صفحات ہی رہے ہیں جن میں انھوں نے خود اپنے بارے میں مجمل معلومات فراہم کی ہیں۔ یوسف خان کمبل پوش کی زندگی کے حالات اور ان کی کسی اور تحریر کا ابھی تک سراغ نہیں ملا تھا۔

ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یوسف خان کمبل پوش کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے پہلے سفرنامے میں 'آغاز حال مؤلف' کے عنوان سے اپنی سوانح کے چند چیدہ چیدہ واقعات تحریر کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطنِ خاص حیدرآباد تھا اور وہ ۱۲۴۴/۱۸۲۸ء میں عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھپور، اکبرآباد اور شاہجہاں آباد وغیرہ سے ہوتے ہوئے لکھنؤ میں وارد ہوئے(۵) لیکن ان کا تعلق حیدرآباد شہر سے تھا یا کسی مضافاتی علاقے سے؟ جب وہ لکھنؤ پہنچے تو ان کی عمر کیا تھی؟ ان کی مصدقہ تاریخِ پیدائش کیا تھی؟ ان کے خاندان کے دیگر افراد کون تھے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب نہ تو کمبل پوش نے خود دیا ہے اور نہ ان کے کسی معاصر کی تحریر سے ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اس بارے میں کوئی اشارہ دیتی ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنے والد کا نام تک نہیں لکھا، حالاں کہ اس زمانے میں مصنفین اپنے خاندانی حالات اور شجرہ نسب کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ البتہ ان کے ایک معاصر سید محسن علی کے تذکرے میں ان کے والد کا نام 'رحمت غوری' بتایا گیا ہے۔(۶)

یوسف خان کمبل پوش کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں مستند معلومات نہیں ملتیں۔ پروفیسر تحسین فراقی نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ ۱۸۲۸ء میں جب وہ لکھنؤ پہنچے تو ان کی عمر تقریباً پچیس برس

ہوگی، یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ وہ ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔(۷) حال ہی میں ایک مغربی محقق مائیکل فشر نے اپنی کتاب Counterflows to Colonialism میں ماخذ کا ذکر کیے بغیر، کمبل پوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۰۳ء درج کر دی ہے۔(۸) لیکن چوں کہ کمبل پوش کے بارے میں اس کی تمام تر معلومات کا ماخذ پروفیسر تحسین فراقی کا مرتبہ سفرنامہ، عجائباتِ فرنگ اور روزی لویلن جونز (Rosie Llewellyn-Jones) کا ایک مضمون ہے۔(۹) لویلن جونز نے تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کیں، اس لیے یقیناً فشر نے یہ تاریخ پروفیسر تحسین فراقی کے تحریر کردہ مقدمۂ عجائباتِ فرنگ سے ہی نقل کی ہے۔

لویلن جونز نے تاریخ پیدائش تو نہیں بتائی مگر یہ ضرور لکھا ہے کہ جب اس سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا، اس وقت کمبل پوش کی عمر غالباً ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔(۱۰) تاہم یہ بیان انھوں نے یا تو کسی ثانوی اور غیر مستند ماخذ سے نقل کیا ہے یا اس بیان کی تصدیق کے لیے جو ماخذ استعمال کیا ہے، اس کی تفہیم میں سہو ہوا ہے۔ یہ ماخذ، غالباً کمبل پوش کے سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۸۷۳ء میں، عجائباتِ فرنگ کے عنوان سے مطبع منشی نول کشور میں شائع ہوا۔ کتاب کے آغاز میں یہ بیان درج ہے:

عجائباتِ فرنگ

یعنی کیفیت سفر یوسف خان کمبل پوش

ملک انگلستان میں

یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں بمقام دہلی طبع ہوئی تھی اور چونکہ مصنف اوس کا باشندہ لکھنؤ کا تھا، اور مالک مطبع سے بھی اس کی ملاقات تھی تو یہ تحفہ یادگار باشندہ اس صوبہ کا سمجھ کر حسبِ تحریک مسٹر جوزف جو ہانس صاحب، جو اخلاق و مروت میں بے عدیل اور فن فوٹوگرافک وغیرہ صناعات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں

ماہ ستمبر ۱۸۷۳ء

مطبع منشی نول کشور میں طبع مزین مطبوع ہوئی

اس بیان سے لویلن جونز نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سفرنامے کی پہلی اشاعت کے بعد (۱۱) لکھنؤ کے 'ایک مطبع کے مالک' نے کمبل پوش سے رابطہ کیا اور ایک معروف فوٹوگرافر جوزف جوہانس کی حوصلہ افزائی پر، جو کمبل پوش کی تصنیف کے بارے میں نہایت اچھی رائے رکھتا تھا، کمبل پوش نے کتاب کی اشاعت ثانی کا فیصلہ کرلیا۔ جب کمبل پوش اپنی کتاب کی اشاعتِ ثانی پر رضامند ہوئے، اس وقت غالباً وہ عمر کی چھٹی دہائی کے وسط میں تھے۔ یہ کتاب جنوری ۱۸۹۸ء میں تیسری بار منشی نول کشور کے مطبع سے شائع ہوئی اور یہ کہ اگر اس وقت تک کمبل پوش حیات تھے تو ان کی عمر ۱۰۰ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ (۱۲) اس بیان سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ دوسری اشاعت لکھنؤ کے کسی اور مطبع میں ہوئی تھی، جو خلاف واقع ہے۔

دوسری اشاعت کے اس تمہیدی بیان سے صاف ظاہر ہے کہ کمبل پوش، کتاب کی دوسری اشاعت کے وقت حیات نہیں تھے کیوں کہ ان کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور ان کی یادگار کے طور پر کتاب شائع کرنے کے خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔ گارسیں دتاسی نے بھی اپنے گیارھویں خطبے میں کمبل پوش کی تاریخِ وفات ۱۰ اگست، ۱۸۶۱ء لکھی ہے (۱۳) جس پر یقین نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن اسی خطبے میں دتاسی نے ان کے بارے میں کچھ بے سروپا باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کے مطابق انھیں ایک اطالوی کیتھولک ظاہر کیا گیا ہے۔ دتاسی کے ان بیانات کا ماخذ انڈین میل کا ستمبر ۱۸۶۱ء کا شمارہ ہے۔ (۱۴) کمبل پوش کی زندگی، سوانح اور خاص طور پر ان کے مذہب کے بارے میں پروفیسر تحسین فراقی اور اکرام چغتائی کے مرتبہ نسخوں میں مفصل بحث ملتی ہے، جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے جابجا اپنے مذہبِ سلیمانیہ کا ذکر کیا ہے۔ اس مذہب سے ان کی کیا مراد تھی، کیا یہ کوئی باقاعدہ فرقہ تھا یا محض ایک خود ساختہ عقیدہ۔ اس بارے میں تمام مباحث قیاس پر مبنی ہیں۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ انھوں نے دونوں تصانیف کا آغاز، مسلمانوں کے عام انداز کے مطابق حمدیہ و نعتیہ کلمات و اشعار سے کیا ہے۔ متن کے دوران بھی کہیں خود کو مسلمانوں سے الگ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے کہ مذہب کا لفظ، اس دور کے عام رواج کے مطابق، مسلک یا طریقے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں تک یوسف خان کمبل پوش کے دیگر حالاتِ زندگی کا تعلق ہے تو اس بارے

میں جملہ معلومات کا حاصل بس یہی ہے کہ وہ ایک شاعر تھے اور لکھنؤ کے معروف شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔(۱۵) پروفیسر تحسین فراقی لکھتے ہیں:

> یوسف خان کمبل پوش کب پیدا ہوا، اس کے والد کا شغل معاش کیا تھا، کمبل پوش نے کہاں تعلیم پائی، اس نے شادی کی یا نہیں، اس کی کتنی اولادیں تھیں، معاصر ادبا کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات تھے اور یہ ایک دوسرے کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے نصیر الدین حیدر کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے اس کا شغل معاش کیا تھا اور یہ کہ 'تاریخ یوسفی' یا 'عجائباتِ فرنگ' کے علاوہ اس نے کون سی تصنیف یادگار چھوڑی، ان تمام سوالات کا جواب فراہم نہیں ہوتا۔''(۱۶)

اکرام چغتائی نے سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کی مشہور تصنیف تذکرۂ غوثیہ میں مذکور ایک کمبل پوش کے متعلق تمام مواد اپنے مقدمے میں یکجا کیا ہے لیکن انھیں بھی یقین نہیں ہے کہ یہ وہی کمبل پوش ہیں جو یورپ کے سفر نامے کے مصنف ہیں۔خود انھیں دہلی شہر کی فارسی تاریخ 'سیر المنازل' (قلمی نسخہ) میں ایک 'گروہ کمبل پوشاں' کا ذکر ملتا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید تذکرۂ غوثیہ میں مذکور کمبل پوش اسی گروہ کا کوئی فرد ہو۔وہ لکھتے ہیں:

> درحقیقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ سفر نامہ نویس کمبل پوش کی صرف ایک ہی تصنیف ہے، جو اب تک دستیاب ہے، یعنی ''تاریخ یوسفی'' جو پہلے فارسی (۱۸۴۳ء قلمی) اور پھر اردو (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) میں لکھی گئی۔ اس کے شروع میں بعنوان 'حال مؤلف' کے تحت اور بیچ میں کہیں کہیں مؤلف نے اپنے جو سوانحی کوائف مختصراً بیان کیے ہیں، وہی مستند ہیں۔بالفاظ دیگر کمبل پوش کے حالاتِ زندگی کا ایک ہی معتبر ماخذ یہ سفر نامہ ہے، جو اس نے ۱۸۴۰ء کے اوائل میں مکمل کر لیا تھا۔اگر اس کی کوئی اور کتاب دریافت ہو جاتی، یا کوئی ایسی معاصر شہادت دستیاب ہو جاتی جس میں اس سنہ کے بعد کی زندگی کا علم ہو جاتا، تو پھر درج بالا مماثل یا متضاد پہلوؤں کی بنیاد پر قیاسی استدلال کی ضرورت نہ پڑتی۔(۱۷)

اس قلمی نسخے کی صورت میں مصنف کی ایک اور تصنیف تو یقیناً دریافت ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تصنیف بھی ان کی زندگی کے چار ماہ سے زیادہ کے حالات سے پردہ نہیں اٹھاتی۔ البتہ اس کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یورپ سے واپس آنے کے بعد وہ دوبارہ لکھنؤ میں اپنی فوجی ملازمت میں مصروف ہو گئے تھے اور غالباً ریاست اودھ کے سقوط (۱۸۵۶ء) تک یہیں رہے۔ ہوسکتا ہے اس دوران، یا اس کے بعد وہ کبھی دہلی بھی گئے ہوں اور غوث علی شاہ سے ان کی ملاقاتیں رہی ہوں، لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کی پہلی کتاب دہلی ہی سے طبع ہوئی تھی۔

اپنے سفرنامے تاریخ یوسفی المعروف عجائباتِ فرنگ میں انھوں نے اپنے جس سفر انگلستان کا حال بیان کیا ہے وہ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۳۸ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ ۱۸۳۸ء میں جب وہ اس سفر سے لوٹے تو ان کی واپسی کی خبر ایشیاٹک جرنل میں ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

A Travelled Native

> Eusoph Khan, soubadhar of Lakhnow, who was on a visit to England, is now safely arrived at Calcutta. He expressed himself highly gratified with the kind treatment and hospitality he received from the nobility and gentry. His remark on English character is worthy of notice: "English men in this country and Englishmen at home are totally different in point of character." He intends to publish his diary, which will no doubt, be very interesting to our native readers, as it will contain accounts not only of England, but of every place he has visited, and of which he talks in terms of high admiration.(۱۸)

اس سفر سے لوٹنے کے بعد کمبل پوش نے زندگی کیسے بسر کی، اس بارے میں اس سے قبل کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ اگر چہ کمبل پوش نے تاریخ یوسفی کے اختتامی صفحات میں بڑی حسرت سے لکھا تھا:

> اب بھی یوسف حلیم کمبل پوش سلیمانی مذہب، ارادہ سیر ملک سیہ پوشوں کا رکھتا ہے اور ایران وتوران و اصطنبول اور روس وماژندران وغیرہ کے جانے پر آمادہ ہے،

بہ سبب لاچاری اور نہ بہم پہو نچنے زادراہ کے یہاں پڑا ہے۔ امیر اور رئیس ہندوستان کے ایسے خیال کب رکھتے ہیں کہ خرچ راہ اور ایک محرر کامل میرے ہمراہ کر کے رخصت کریں۔ بندہ ملکوں میں پھرے اور بے کم وکاست حال ہر جا کا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرے۔ اگر یاوریٔ بخت سے کوئی متکفل خواہش میری کا ہوا، فبہا۔نہیں تو فقیر تھوڑے دنوں میں راہی ہوگا۔ خدا مسبب الاسباب ہے، کوئی سبب کر دے گا۔ یا جامہ فقیری پہن کر سیر ملکوں کی کرے گا۔(۱۹)

یورپ سے واپسی کے بعد کمبل پوش کی خواہش سیر وسفر کا متکفل کوئی امیر ورئیس تو نہ ہوا، البتہ خود اپنی فوجی نوکری انھیں اودھ کے گرد ونواح میں جا بجا لیے پھری۔ انگلستان سے واپسی پر کمبل پوش نے اپنے لیے کوئی مناسب روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھ کئی ولایتی افسروں کی سفارشی چٹھیاں لائے تھے جو انھوں نے لکھنؤ میں انگریز فوجی افسروں کی خدمت میں پیش کیں۔ وہ سب کے سب کمبل پوش سے 'کمال اخلاق اور عنایت' سے پیش آئے مگر یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ 'ہم کو شاہ اودھ کی فوج میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں'۔(۲۰) تاہم ان کے پرانے مربی ومحسن کپتان میگلس (۲۱) نے کچھ تدبیر کی اور شاہی دربار سرکار میں سفارش کر کے ان کی پرانی اسامی بحال کروادی، یعنی اپنی ہمراہی میں فوجی رسالے (رسالہ سلیمانیہ) میں صوبے دار مقرر کر دیا اور کمبل پوش کو مسلسل اپنے طعام میں شریک رکھا۔ کمبل پوش نے بھی اس احسان کا اتنا پاس رکھا کہ جب ڈاکٹر کار بائن کی سفارش پر قندھار جانے والی انگریزی پلٹن میں ان کی نوکری کا امکان پیدا ہوا تو محض کپتان میگلس کی پاس داری کے خیال سے اس پرکشش نوکری کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ تاہم سیر وسفر کی آرزو مسلسل ان کے دل میں ہیجان برپا کرتی رہی اور اس ہیجان کی لرزش ان کی تحریروں میں بھی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔

کمبل پوش رسالہ سلیمانیہ کے ہمراہ، جس میں وہ صوبے دار کے عہدے پر فائز تھے (۲۲)، سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ریاست اودھ کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ ان کی دقیق قوت مشاہدہ اور زود حس طبیعت ریاست اودھ کے دار الحکومت لکھنؤ اور اس کے گرد ونواح میں ڈاکوؤں کی لوٹ کھسوٹ، اخلاقی اقدار کی پامالی اور غربت و افلاس کی صعوبتوں سے از حد متاثر

ہوئی۔اس زمانے کے عمومی رجحان کے برعکس انھوں نے اپنے تاثرات کو نہ صرف جامۂ الفاظ عطا کیا بلکہ ایک باقاعدہ مسودے کی صورت میں مرتب بھی کیا۔پہلی کتاب کی اشاعت بھی ان کی حوصلہ افزائی کا باعث تھی چنانچہ انھوں نے ایک اور سفرنامہ تحریر کیا۔لیکن مرورِایام کے ہاتھوں یہ سفرنامہ نہ تو طباعت واشاعت کی منزلوں سے گزرا اور نہ ہی کسی اہلِ علم و ذوق کے ہاتھ لگا۔۲۰۱۳ء کے اوائل میں راقم الحروف کو لندن یونی ورسٹی میں اپنی فیلوشپ کے دوران، اتفاق سے بوڈلین لائبریری کے قدرے دوردراز گوشے میں یہ نسخہ نظر آ گیا۔

یہ نسخہ خاصی مخدوش حالت میں ہے۔خستہ اور پیلے پڑ جانے والے، ہلکے اور سستے قسم کے کاغذ پر خطِ نستعلیق میں موٹے قلم اور سیاہ روشنائی سے لکھے گئے حروف انیسویں صدی کے اردو املا کا نمونہ ہیں۔کاغذ اتنا پتلا ہے کہ ورق کے دونوں طرف لکھے ہوئے الفاظ دیکھے جاسکتے ہیں۔مسودے کا آغاز پیشانی پر لکھے گئے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

۱۔ یا فتاح حقیقی

صفحے کے وسط میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' رقم ہے جس کے بعد کچھ وقفہ دے کر عبارت کا آغاز ہوتا ہے۔ حمدیہ کلمات کے بعد خواجہ میر دردؔ کے درج ذیل دو اشعار درج ہیں:

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
اوس * مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

(* دیوانِ درد میں ''اوس'' کی بجائے ''جس'' ہے)

بعد ازاں حضرت محمد مصطفیٰ علیہ السلام ﷺ کے حضور ہدیۂ درود و سلام پیش کیا گیا ہے اور درج ذیل فارسی اشعار لکھے گئے ہیں:

جنت سرائے بارِ تو، رضواں امانت دارِ تو
اے از گلِ رخسارِ تو، فردوسِ اعلیٰ را صفا

اے تاج بخشِ سروراں، ہم خاتم پیغمبراں!
ہستی تو اے صاحب قرآں! دردین و دنیا بادشاہ
تخت فلک، تاجت قمر، مہرت (الم جولا قمر *)
فتحت قرین، یارت ظفر، تیغت قدر، دستت قضا
(*یہ الفاظ درست طور پر پڑھے نہیں جا سکے۔)

نعتیہ اشعار کے فوراً بعد مصنف نے اپنا تعارف اور مقصدِ تصنیف بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بعد حمد و نعت کے امیدوار ہوں رحمت ایزدی خطا پوش و نیوش یوسف خان کمل پوش کہ اس عاجز نے اکثر سیر ملکوں میں اوقات اپنی بسر کی اور طرح طرح رنگِ زمانہ بچشم دیکھے۔ چناں چہ موافق فرمانے دوستوں کے ایک کتاب بھی بعبارتِ اردو قلم بند کی اور سبب عنایاتِ بے غایات اور پرورشِ حال غریبانہ اوپر حال بندہ کے، جناب کپتان صاحب عالی رتبت، والا مرتبت، فیاض زمان کپتان ہالن صاحب بہادر نے بیچ مدرسہ دہلی میں چھپوائی۔ تحریر و تقریر ثنا وصفتِ صاحبان انگریزوں میں غیر ممکن۔ کہاں تک بیان کرے جو کہ مرتبہ غربت اور مہربانی حال دوستوں اور جملہ مخلوقات پر صاحبان انگریز بہادر رکھتے۔ آفرین، صد آفرین! حق و ناحق خوب پہچانتے ہیں اور ہر وقت راہ نیک پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ آفرین! ہزار آفرین! چناں چہ اس زمانۂ ناہنجار میں چندے سیر ملک اودھ بھی دیکھنے میں آئی کہ بیان کرنا اس کا طبیعت نے چاہا کہ دوستوں اور محبوں، حاضر اور غائب پر پوشیدہ نہ رہے''۔

اسی اقتباس سے راقم الحروف نے اس سفرنامے کا عنوان **سیرِ ملکِ اودھ** اخذ کیا ہے۔ اس کے بعد ۱۵۶ اوراق پر مشتمل یہ خطی نسخہ تقریباً چار ماہ کے احوال کا مسلسل بیانیہ ہے جو مصنف نے اپنے فوجی رسالے کے ہمراہ لکھنؤ اور اس کے گردونواح اور دیگر کئی علاقوں کے سفر میں گزارے۔ کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

''۔۔۔بعدہٗ بتاریخ چہاردہم ذی الحجہ ۱۲۶۳ ہجری، روز سہ شنبہ، مطابق تیسویں

نومبر، سنہ عیسوی، وقت صباح کے، چناں چہ لاٹ صاحب بہادر نو بجے روانہ سمت پچھم از راہ کانپور ہوئے کہ دو سو ضرب توپوں کی سلامی رخصتی کی ہوئی اور راجا غالب جنگ بہادر اور ایک پٹالن ہمراہی ممتاز خان کپتان بنوری بہادر اور ایک کمپنی ہمراہی کپتان بارلو صاحب بہادر اور دیگر متفرقات فوج کمپنی پٹالن ہندوستانی وغیرہ ہمراہی لاٹ صاحب بہادر کے، واسطے بندوبست اور رسد رسانی اپنے ملک کے پہر میں ہمراہ رکاب جناب لاٹ صاحب بہادر کے ہوئے۔اور اُسی طرح خیمہ وڈیرہ جابجا مقام بمقام ایستاد کیے گئے کہ تکلیف کدام امر کی واقع نہ ہو۔فقط تمام''۔

اگر اس اقتباس کے اختتام پر، 'فقط تمام' کے الفاظ درج نہ ہوتے تو گمان ہوتا کہ مسودہ ناقص الآخر ہے، یا نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے۔تاریخ یوسفی کے اختتام پر جو ترقیمہ درج ہے، اس کا اختتام بھی 'فقط' پر ہوتا ہے۔اس سفرنامے کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ سے واپس آنے کے بعد کمبل پوش نے اپنی فوجی نوکری کے دوران ہندوستان کے طول وعرض کی خاک چھانی۔ پہلے تو وہ سات برس تک اپنے مربی کپتان میگنس کے ہمراہ سیلون، سلطان پور اور بیسواڑہ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔پھر لکھنؤ پہنچے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔ اس کے بعد، واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں، فوجی احکامات کے مطابق، ۱۶ شعبان ۱۲۶۳ ہجری (۳۰ جولائی، ۱۸۴۷ء) کو لکھنؤ کے نواحی علاقوں کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اسی سفر کے دوران اپنے تجربات و مشاہدات کو انھوں نے ایک سفرنامے یا رپورتاژ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۴ ذوالحج ۱۲۶۳ ہجری (۲۳ نومبر ۱۸۴۷ء) تک کے واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔اس دوران انھوں نے علاقہ بانگر، منڈیاون، بنی گنج، میاں گنج، حسن گنج، موہان، فتح گنج، کڑا اور کانپور کے علاقوں کی سیر کی۔انھیں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے سلطان پور بھی بھیجا گیا۔مگر جو شان وشوکت اور خوبی کانپور میں دیکھنے کو ملتی ہے، اس کا شائبہ بھی دیگر علاقوں، حتیٰ کہ لکھنؤ میں بھی نظر نہیں آتا۔کانپور کی عظمت اور شان وشوکت سے مرعوب ہونے کی وجہ

صاف ظاہر ہے کہ وہاں انگریزوں کی عمل داری قائم تھی، جب کہ ریاست اودھ میں اس وقت آخری تاجدار واجد علی شاہ کی حکومت تھی۔ واجد علی شاہ ۱۳فروری ۱۸۴۷ء کوتخت نشیں ہوئے تھے اور ۱۱فروری ۱۸۵۶ کوانگریزوں کے ہاتھوں معزول ہوئے۔

کانپور کے علاقے پر انگریزوں نے اس سے بہت پہلے قبضہ جمالیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۷۰ میں کانپور میں، جو اس وقت اودھ کی عمل داری میں تھا، پہلی بار اپنی فوجی چھاؤنی قائم کی تھی۔ بظاہر اس چھاؤنی کا مقصد سلطنت اودھ کو مرہٹوں اور روہیلوں کے حملوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے کمپنی اپنی فوجی چھاؤنی کے کل اخراجات اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے وصول کرتی تھی، لیکن درحقیقت اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو شمالی ہندوستان میں قدم جمانے اور عسکری قوت جمع کرنے کا قانونی جواز حاصل ہوگیا تھا۔ اگلے تین سالوں کے دوران کانپور کی یہ چھاؤنی، کمپنی پریزیڈینسی یعنی کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے باہر، کمپنی کا سب سے بڑا فوجی مرکز بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۱ میں نواب شجاع الدولہ کے صاحب زادے اور اودھ کے نئے حکمران نواب سعادت علی خان کو مجبور کیا گیا کہ وہ کانپور اور اس سے ملحق سلطنت اودھ کے چند دیگر علاقوں سے کمپنی کے حق میں دست بردار ہوجائیں۔ چناں چہ کانپور میں انگلستان سے آنے والے مختلف لوگوں کی ضروریات اور سہولیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جدید شہر بسایا گیا جو سلطنت اودھ کے دارالحکومت لکھنؤ سے صرف ۶۰ میل کے فاصلے پر تھا اور جہاں یورپی باشندوں کی سہولت کے لیے ہر طرح کی شہری ترقی کا سامان موجود تھا۔(۲۳) یوسف خان کمبل پوش کو یورپ سے آئے دس برس ہونے کو تھے مگر اس جنت گم گشتہ کے نشان اگر انھیں ریاست اودھ کے گردونواح میں کہیں نظر آسکتے تھے تو وہ مقام کانپور ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کانپور کے بیان میں ان کے اشہب قلم کی جولانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ سفرنامہ اپنے عہد کے لکھنؤ کی دلچسپ تصویر پیش کرتا ہے جو ایک طرف تو شاہی عہدے داروں کے تزک واحتشام اور شان وشوکت کے شاندار مرقعوں سے مزین ہے اور دوسری طرف عوام الناس کی بدحالی، بے بسی اور بے چارگی کی ٹوٹ پھوٹ اور کسک کی عکاس ہے۔ مبالغے کی صنعت اس دور کا خاصہ تھی۔ چناں چہ اس سفرنامے میں بھی کوئی بات تفصیل کے صیغوں کے بغیر بیان نہیں

ہوتی۔ اودھ کی ریاست میں سلطانی افواج کی درندگی اور بہیمیت کے جو قصے بیان کیے گئے ہیں انھیں پڑھ کر لگتا ہے کہ ہم جس لکھنوی تہذیب کا غلغلہ سنتے رہے ہیں، وہ دربار اور اس کے گرد ونواح تک ہی محدود تھی۔ دیہات اور قصبات میں عوام کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ قانون اور انتظام نام کی کوئی چیز اس گرد وپیش میں نظر نہیں آتی۔ مکمل بے انتظامی، لوٹ کھسوٹ، انتشار اور پراگندگی۔ جہاں کسی مزدور سے رقم نکلوانے کے لیے سپاہی اس کی معصوم بیٹیوں کو شدید سردی میں تقریباً برہنہ قید رکھتے ہیں۔ لڑکیاں چاہنے والوں کے ساتھ مل کر ماؤں کو قتل کر دیتی ہیں۔ بے شمار مفت خور لوگ، جو نوکری چاکری تو نہیں کرتے البتہ اس توقع پر کمر بستہ رہتے ہیں کہ کبھی جنگ ہو اور توپ چلے تو خوب لوٹیں۔ لڑائی یا جنگ ہی پر کیا منحصر ہے، ’’بے لڑائی بھی، کسی کی کان کی بالی، کسی کے ناک کی نتھ، کسی کی بانہہ کا کڑا، موقع پایا اور مار لیا۔ اور اگر بے مرد کا گھر دیکھا، ان کی بہو بیٹی کے ساتھ حرام کیا۔ وہ بے چاری دہائی اور رواویلا کر رہی ہیں، کوئی نہیں، جو سنتا ہے‘‘۔

کیا اس زمانے میں ریاست اودھ کا انتظام واقعی ایسا ہی تھا جیسا کمبل پوش نے بیان کیا ہے یا اسے کمبل پوش کے مخصوص نجی وشخصی تجربات وتحفظات اور حالات وترجیحات کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے وسط کے لکھنؤ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اہلِ تحقیق کے لیے اس سفرنامے میں کئی امکانات موجود ہیں۔ دراصل یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز بہادر، کمبل پوش جن کے حسن انتظام کے گن گاتے نہیں تھکتے، اودھ کی زرخیز اور خوش حال ریاست ہتھیانے کے منصوبوں کو آخری شکل دے رہے تھے۔ مغربی سیاست کا قدیمی، کارآزمودہ اور ابھی تک مؤثر ہتھیار پروپیگنڈا ہے۔ خاص طور پر انگریز قوم طویل المدت منصوبہ بندی کی عادی اور ماہر ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ سلیمن کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب ’’A Journey Through the Kingdom of Oude‘‘ کم وبیش اسی دور میں ریاست اودھ کے احوال پر مبنی بیانیہ ہے۔ یہ سفر ۵۰۔۱۸۴۹ء کے دوران کیا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست میں بدانتظامی اور بدعنوانی کے ایسے شواہد مہیا کیے جائیں جن کی مدد سے اودھ پر کمپنی کے تسلط کو جائز، عوام دوست

اور منصفانہ ظاہر کیا جا سکے۔ اگر چہ سلیمن اودھ کی ریاست پر قبضہ جمالینے کو سیاسی مصالح کے خلاف سمجھتے تھے اور انھوں نے اس عمل کی حتی الوسع مخالفت بھی کی تھی لیکن ان کی یہ کتاب بلا شبہ اودھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے نا جائز تسلط کا ایک وسیلہ بن گئی تھی۔ (۲۴)

اسی قسم کی ایک اور کتاب ایک گم نام مصنف کے حوالے سے ولیم ناٹن نے بھی مرتب کی تھی جس کا عنوان تھا: The Private Life of an Eastern King Together with Elihu Jan's Story or the Private Life of an Eastern Queen۔ یہ کتاب کمبل پوش کے ممدوح نصیر الدین حیدر اور اس کے محل کے حالات پر مبنی ہونے کی دعوے دار ہے۔ کتاب کا مصنف اپنا نام اور شناخت ظاہر نہیں کرتا اور خود کو محل کا ایک عہدے دار ظاہر کرتے ہوئے، عوام کے مفاد میں ریاست کے حکمران کی کردار کشی کرتا ہے۔ ولیم ناٹن جیسا تجربہ کار انسان اس گم نام کتاب کو شائع کرنے کی جرأت رندانہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یوں خود اپنے ہم وطنوں اور اعلیٰ طبقے کے ہندوستانیوں کو جو انگریزی پڑھنا لکھنا جانتے ہیں، ریاست کے حکمرانوں سے بد دل و بدگمان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب کے مشمولات کی بنا پر یہ ثابت کیا گیا کہ ریاست اودھ پر کمپنی کا قبضہ ریاست کے عوام کے بہترین مفاد میں ہے نیز یہ کہ انھیں غیر اخلاقی، بدکردار حکمرانوں کے چنگل سے آزاد کرانا کتنا ضروری اور اعلیٰ کام ہے۔ (۲۵)

دوسری طرف جب اودھ پر قبضہ مکمل ہو چکا اور واجد علی شاہ معزول کر کے کلکتہ بھیج دیے گئے تو انھوں نے اپنا ایک اعلیٰ سطحی وفد، اپنی والدہ، بیٹے، ولی عہد اور بھائی کی قیادت میں ملکۂ وکٹوریہ کے حضور روانہ کیا۔ اس وفد میں واجد علی شاہ کی جانب سے مولوی مسیح الدین کو مختار مقرر کیا گیا تھا جنھوں نے بادشاہ کا مقدمہ بڑی بے خوفی سے لڑا۔ جب وہ عوام اور پارلیمان کے اراکین کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک طرف تو ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ چھڑ گئی اور ہندوستانیوں کے انگریز عورتوں اور بچوں پر ڈھائے گئے مظالم کی کہانیاں گردش کرنے لگیں (۲۶) اور دوسری طرف انھی مذکورہ شواہد کی بنا پر واجد علی شاہ

کی حکومت کی بدعنوانیوں پر مشتمل ایک بلیو بک (Blue Book) چھاپ کر تقسیم کر دی گئی۔ مولوی مسیح الدین نے اس بلیو بک کے جواب میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی اور لندن سے طبع کروائی مگر انگریز سرکار نے اس کتاب کے تمام نسخے جلوا ڈالے۔(۲۷) کیوں نہ جلواتے، آخر پروپیگنڈے کا ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت دشمنوں کو تو نہیں دی جاسکتی۔ انگریزوں سے بڑھ کر کسے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ ہتھیار کتنا کارآمد رہا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ سچ اور درست ہیں لیکن سیاسی حقائق سے ہٹ کر دیکھیں تو معاشرتی اور سماجی سطح پر تصویر کا دوسرا رخ بھی قابل توجہ نظر آتا ہے۔ نوآبادیاتی عہد جہاں سیاسی اور معاشی استحصال اور ظلم و جبر کی مثال ہے، وہاں معاشرتی سطح پر اپنے اندر کئی مثبت اور تعمیری مضمرات کا حامل بھی رہا ہے۔ بدقسمتی سے نوآبادیاتی ادوار کے مطالعے میں یک رخی اور انتہا پسندی کا رویہ غالب رہا ہے۔ کچھ محققین، اپنے ذہنی اپچ یا مخصوص نظریات کے تحت نو آبادیاتی نظام کی خامیوں اور ان کے بھیانک نتائج پر نظر رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ تاریخ کے صفحات میں ان کے لیے کافی مسالا موجود ہے۔ اورینٹل ازم یا شرق شناسی کی تحریک کے ردعمل میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ عموماً اسی ذیل میں آتا ہے۔ دوسری طرف کچھ حضرات جرأت کر کے مغرب کی خوبیوں اور احسانات کے گیت گاتے ہیں لیکن منفی پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ استعماری نظام نے صرف ہندوستان ہی نہیں، اپنی تمام نوآبادیات میں غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کا اصل مقصد نوآبادیات پر اپنے قبضے کو طوالت بخشنا اور مفتوحہ علاقوں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنا تھا۔ اگر انھوں نے یہاں کی خوش حالی کے لیے منصوبے بنائے، یہاں کے پس ماندہ اور ویران علاقوں کی تعمیر و ترقی کے لیے قربانیاں دیں، یہاں کی زبانوں اور ادبیات کو فروغ دینے کی کوشش کی اور یہاں معاشرتی اداروں کو منظم کیا، تو اس کا مقصد حصول ثواب نہ تھا۔ یہ تمام اقدامات ان کے اپنے مفادات کے تابع تھے۔ ان میں سے بیشتر اقدامات تو غلام سلطنتوں

کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئے لیکن کچھ اقدامات ایسے بھی تھے جنھوں نے نوآبادیاتی سلطنتوں پر نئے امکانات کے دروا کر دیے۔

صرف ہندوستان ہی کو پیش نظر رکھیں تو ایک نئی اور مؤثر زندگی کے کتنے ہی وسیلے اسی استعمار کے عطا کردہ ہیں۔ معاشرتی نظم وترتیب کا کام، مغل سلطنت میں بھی عمدگی سے ہوتا تھا لیکن اس کا طرز قدیم اور اسی مناسبت سے سست روی کا شکار تھا۔ مغربی اقوام نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں ایک تیز رفتار اور مؤثر و منظم طرزِ حیات اپنا لیا تھا اور یہی ان کی سیاسی وعسکری برتری کا باعث بنا تھا۔ اسی نظام کو انھوں نے اپنے نوآبادیات میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کے نتیجے میں سیاسی وعسکری تسلط تو، ان کے حسب منشا، خود انھی کے پاس رہا لیکن معاشرتی تنظیم کا سلیقہ حسب استطاعت، مغلوب قوموں نے بھی سیکھ لیا۔ سڑکیں اور شاہراہیں، سرائیں اور مہمان خانے تو ہر دور میں حکمران بنواتے رہے لیکن بھاپ کا انجن، ریلوے، نہروں کے جال، بے آباد زمینوں کی منظم آبادکاری، تار برقی اور ایسے کتنے ہی دوسرے نظام انھی غاصبوں کے عطا کردہ ہیں۔

یہ سب نظام مغربی تہذیب کے محض خارجی مظاہر ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر قوت اور طاقت عطا کرنے والا ہنر یہ تھا کہ کوئی قوم اپنی افرادی قوت کو کس طرح مستعد، ہشیار، قابل اور منظم بناتی ہے۔ افراد کی تربیت میں اخلاقی پہلو بھی شامل تھے اور انتظامی امور کی مؤثر انجام دہی کا تصور بھی، جو کسی فرد کی شخصیت کا جوہر سمجھا جاتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے نظام اخلاق کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوں جو ایک مذہبی معاشرے کے تصور اخلاق سے میل نہ کھاتے ہوں، لیکن مغرب نے افراد کے شخصی امکانات، ان کی خلقی استعدادِ کار اور ان کی نفسیاتی ضروریات کا ادراک کر کے انھیں اجتماعی وقومی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ طویل المدت منصوبہ بندی، وقت کی پابندی، پیشہ ورانہ دیانت داری اور خلوص، محنت، فیصلہ سازی کے عمل میں ذاتی پسند ناپسند پر قواعد وضوابط کی فوقیت، فرائض منصبی کی اہمیت، یہ وہ چند خصائص ہیں جن کی تربیت دے کر اور انھیں ایک نظام کی صورت میں نافذ کر کے مغرب نے اپنی

افرادی قوت کو اپنا بہترین ہتھیار بنالیا تھا اور یہی وہ خصائص تھے جن سے کم از کم انیسویں صدی تک ہندوستانی عوام کی اکثریت بے بہرہ ہو چکی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عوام تو اس دور میں کسی طور قابلِ غور ہی نہ تھے۔ ہر بات، ہر منصوبہ، ہر نظام خواص مرکز اور خواص پسند تھا اور خواص خود کو کسی بھی نظام کی پابندیوں میں جکڑنے کو تیار نہیں تھے۔

نوآبادیاتی عہد میں مغرب نے مغلوب قوموں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے انھیں بھی سزا اور جزا کے مؤثر نظام کے ذریعے، اسی طریقہ کار کے مطابق تربیت دی۔ (یہی وجہ ہے کہ آج بھی مغرب کے تربیت یافتہ افراد ہر شعبے میں فائق وممتاز سمجھے جاتے ہیں) اس عمل کے نتیجے میں، یوسف کمبل پوش جیسے چند ایک ہندوستانیوں کو مغربی نظامِ معاشرت کی خوبیوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور وہ اس نظام کی چکاچوند سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ اس کی کمزوریوں کی طرف نگاہ نہ کر سکے۔

آج کے اس مابعد نوآبادیاتی دور میں اس بارے میں غور وفکر کرنا ایک مختلف نوعیت کی سرگرمی ہے لیکن انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستانی عوام، مغربی اقوام کے بارے میں کیا سوچتے تھے، ان کے طرزِ حیات اور بودوباش کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے تھے، ہندوستان اور مغربی معاشرے کے درمیان تقابل کی نوعیت کیا تھی، ان تمام سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے کمبل پوش کے اس سفرنامے کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کمبل پوش کی اہمیت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے نصف اول تک کے عرصے میں یورپ جانے والے دیگر ہندوستانیوں (جن میں زیادہ تر مسلمان شامل تھے) کی نسبت ایک مختلف معاشرتی پس منظر کا حامل تھا۔ وہ نہ تو انیسویں صدی کے پہلے دو سالوں میں یورپ جانے والے ابو طالب اصفہانی کی طرح کسی ریاست کا نواب یا جاگیردار تھا، نہ مرزا اعتصام الدین یا منشی اسماعیل کی طرح کسی انگریز کا منشی جو اسے ہندوستانی زبانیں سکھانے پر مامور ہوا اور نہ نواب عبدالکریم کی طرح کسی سفارتی وفد کا رکن، جو انگریزوں سے اپنے مفادات کے تحفظ، اقتدار کی بھیک یا دشمنوں کی ذلت کا مطالبہ یا منصوبہ منظور کرانے

انگلستان پہنچا ہو۔ وہ تو ایک رند مشرب، آزاد رو، فقیر صفت، بے باک اور متجسس طبیعت کا مالک شخص تھا۔ حیدرآباد اس کا وطن خاص تھا، جہاں سے وہ پھرتا پھراتا لکھنؤ پہنچا اور اس دور کے دستور کے مطابق ایک انگریز فوجی افسر کی وساطت سے، جو محض ایک کپتان تھا، اودھ کی شاہی فوج کے رسالۂ سلیمانیہ میں پہلے جمعدار کے طور پر بھرتی ہوا اور پھر جلد ہی ترقی پا کر صوبے دار ہو گیا۔ اس کے بعد وہ فوجی نوکری سے دو سال کی رخصت منظور کروا کے، یورپ کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ اس سفر کے مقاصد اس نے خود اپنی زبانی صرف اتنے ہی بیان کیے ہیں:

> ''ناگہاں شوق تحصیلِ علم انگریزی کا دامن گیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اوس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرنا، دیکھنے حال شہروں اور راہ ورسمِ ملکوں سے محظوظ ہونا، اک بارگی سنہ اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں دل میرا طلب گار سیاحی جہان، خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت و اکرام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجا لایا اور راہی منزل مقصود کا ہوا''۔ (۴۸)

اس بیان سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کی کتابیں پڑھنے اور انگریزی زبان سیکھنے کے بعد، من کی موج میں بہتا بہتا کمبل پوش انگلستان جا نکلا۔ کوئی انگریز مسافر رفیق سفر کے طور پر اس کے ساتھ نہ تھا۔ انگلستان میں بھی اس کی سرگرمیاں سیاسی یا معاشی نوعیت کی نہ تھیں اور اس بیان پر یقین نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ پہلا سیاح تھا جو محض ذوقِ سفر کی تسکین کے لیے انگلستان روانہ ہوا۔ ۱۷۹۹ میں یورپ جانے والے ابو طالب اصفہانی بھی بظاہر کسی خاص مقصد کے بغیر اس سفر پر روانہ ہوئے تھے لیکن ان کا تعلق طبقۂ اشرافیہ سے تھا اور ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی نوعیت مختلف تھی۔ کمبل پوش تو عوام الناس میں سے ایک تھا۔ اس کے پاس نہ تو خاندانی شجرۂ نسب کی سیڑھی تھی، نہ علمی و ادبی میدان میں شہرت و مقبولیت کی سند۔

انگلستان کی معاشی و معاشرتی ترقی اس کے لیے ایک طلسم کدے سے کم نہ تھی۔ وہ ولایت کی

ہر بات سے متاثر ہوا۔ وہاں کے باشندوں کے عمومی اخلاق، مرد وزن کی مساوات اورعورتوں کی معاشی ترقی میں شرکت، روزمرہ امور میں تنظیم وترتیب، سڑکوں کے کنارے جلتے ہوئے لیمپ، پیدل چلنے والے راہ گیروں کے لیے فٹ پاتھ، باغوں اور روشوں کی تازگی، فوارے اور مجسمے، مکانوں کی تعمیر میں یکسانی اور ترتیب و تنظیم کا اہتمام، گلی کوچوں کی صفائی ستھرائی، تزئین و آرائش، یتیم اور لاوارث بچوں کے لیے قائم ادارے، حتیٰ کہ گم راہ ہوکر بے گھر ہوجانے والی خواتین کے لیے بھی ٹھکانے کا بندوبست، مومی مجسموں کا عجائب گھر، ناچ گھر، سینما، تفریح کے مواقع، یہ سب کچھ کمبل پوش کومبہوت و متاثر کرتا ہے اور وہ قدم قدم پر یورپ کے معیارِ زندگی کا مقابلہ ہندوستان سے کرتا ہے۔ یہ تقابل اسے کڑھنے اور اپنے ہم وطنوں کی جہالت، پس ماندگی اور فکری افلاس کے ماتم کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دنوں کمبل پوش نے انگلستان کا سفر کیا، کم وبیش انھی دنوں میں ایک فرانسیسی مفکر اور سیاست دان Alexis de Tocqueville (۱۸۰۵۔۱۸۵۹ء) بھی انگلستان پہنچا اور اپنے سفر کے تاثرات بیان کیے۔ مگر اسے انگلستان میں انقلاب کی آہٹ سنائی دی اور اس نے طبقاتی امتیازات کو شدت سے محسوس کیا۔ انگلستان کے بارے میں اس کے مشاہدات وتجربات کمبل پوش کے مشاہدات سے بالکل مختلف اور برعکس تھے۔ (۴۹) اس تقابلی مطالعے سے انیسویں صدی کے ہندوستان کی عمومی ذہنی سطح کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے اور ایشیائی اور یورپی ذہن کے درمیان فرق کی نوعیت محسوس کی جا سکتی ہے۔

کمبل پوش کے مشاہداتِ یورپ کے حوالے سے ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کمبل پوش کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ حیدرآباد ایک خوش حال مسلمان ریاست کا دارالحکومت تھا۔ ۱۷۹۸ء میں یہ ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک معاہدے کے نتیجے میں Princely State قرار پا گئی تھی۔ حیدرآباد تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز رہا تھا۔ عوام امن و اطمینان اور سکون و آشتی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کمبل پوش نے اپنا بچپن اسی شہر میں گزارا ہے تو یقیناً وہ ایک خوش حال ہندوستانی معاشرے کے امکانات کا شاہد رہا ہوگا۔ پھر حیدرآباد سے نکل کر وہ مختلف علاقوں میں گھومتا رہا، جن میں عظیم آباد، ڈھاکہ، گورکھ پور، اکبرآباد اور شاہجہاں آباد جیسے آباد و پر رونق شہر شامل ہیں۔ دلی میں اس کے قیام اور سرگرمیوں کا ایک اشارہ معروف صوفی قلندر سید غوث علی شاہ کے ملفوظات پر مبنی 'تذکرہ غوثیہ'

میں ملتا ہے جس کی تفصیل اکرام چغتائی صاحب نے 'تاریخِ یوسفی' کے مقدمے میں بیان کی ہے۔(۴۰) اگر یہ مان لیا جائے کہ تذکرۂ غوثیہ میں مذکور کمبل پوش اور اردو کا پہلا سفرنامہ نگار یوسف خان کمبل پوش ایک ہی شخصیت ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی میں کافی عرصہ قیام پذیر رہا۔ دہلی مغل حکومت کا پایۂ تخت ہی نہیں، مغلئی تہذیب وتمدن کا گہوارہ بھی تھا۔ مغلوں کی تعمیر کردہ عالی شان عمارتیں، باغات، محلات اور حویلیاں اس شہر اور اس کے گردونواح میں بکھری ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود کمبل پوش کو ہندوستان بھر میں کوئی ایسی شے نظر نہیں آتی جو انگلستان کی تمدنی زندگی کی برابری کر سکے۔ وہ یورپ کے معاشرے سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے۔

کیا کمبل پوش کا نقطۂ نظر یک طرفہ اور صریحاً جانب دارانہ تھا؟ کیا اس نے جان بوجھ کر خود اپنے وطن کی تضحیک اور غیروں کی تحسین کا التزام کیا؟ عصرِ حاضر کی صحافتی زبان میں کیا وہ کسی "بیرونی ایجنڈے" پر عمل پیرا تھا؟ کمبل پوش کے اغراض ومقاصد کے بارے میں خارجی شواہد تو ابھی تک دستیاب نہیں ہیں البتہ اس کی تحریر پڑھ کر ایسا کوئی تاثر نہیں ملتا۔ اس کے برعکس وہ اپنے ہم قوموں کی ذہنی وفکری پستی پر فریاد کناں نظر آتا ہے۔ اسے دکھ ہوتا ہے کہ مغربی اقوام نے اپنی ذہانت اور محنت سے زندگی کو جو معیار اور قدر عطا کر دی ہے، اس کے ابنائے وطن اس کے تصور سے بھی محروم ہیں۔ جگہ جگہ وہ مغرب کا موازنہ ہندوستان سے کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کے لب ولہجے میں یہ حسرت اور تمنا صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے کہ کاش اس کے اہلِ وطن بھی سیاست ومعاشرت کے ان قرینوں سے واقف ہوتے جنھوں نے مغرب کے انداز زیست کو رعنائی اور بلندی عطا کر دی ہے۔

پہلے سفرنامے میں نظر آنے والی ذہنی فضا کا دوسرا رُخ اس کے دوسرے سفرنامے میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ دوسرا سفرنامہ بھی اسی ذہنی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اب وہ سیرِ مغرب سے واپس آچکا ہے اور اودھ اور اس کے گردونواح کی حالت اسے اور بھی عبرت آموز اور روح فرسا نظر آتی ہے۔ وہ جس طرف بھی نظر ڈالتا ہے، اسے بے انتظامی، لاقانونیت، بداخلاقی اور بدتہذیبی نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے میں جن علاقوں کا احوال بیان کیا ہے وہ ریاستِ اودھ کے مرکزی شہر نہیں، بلکہ مضافاتی دیہات اور قصبے ہیں، جہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ طاقت ہی وہاں جینے کا اصل اصول ہے۔ یہ نہیں

کہ انفرادی سطح پر انسانیت، ہمدردی، اخلاق اور تہذیب وشائستگی کی مثالیں ناپید ہیں۔ ذاتی سطح پر تو شجاعت وحمیت بھی تھی اور غیرت ودین داری بھی، روشن خیالی ورواداری بھی تھی اور سخاوت ودریا دلی بھی۔ لیکن ان سب کا دارومدار فرد کی اپنی ترجیح پر تھا۔ کمبل پوش جس بات کا رونا روتا ہے، وہ ملکی، قومی یا حکومتی سطح پر ایسے نظام کی عدم موجودگی ہے جو ہر شخص کو عزت اور شائستگی سے جینے کا موقع ہی نہیں فراہم کرتا بلکہ اس کا پابند بھی کرتا ہے۔ ایک ایسا نظام جس کے تحت معاشرتی سطح پر انصاف اور مساوات محض حکمران کی ذاتی صوابدید پر منحصر نہ ہو بلکہ ایک مستقل نظام کی صورت میں جاری وساری رہے۔ اور یہی وہ بنیادی کمزوری تھی جس نے ہندوستان کو مغربی استعمار کا تر نوالہ بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مغلوں کے دورِ عروج میں معاشرتی نظام خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن کم از کم انیسویں صدی کے نصف اول تک تو صورت حال خاصی ابتر تھی۔ کمبل پوش نے اس صورت حال کی چشم دید گواہی دی ہے۔ وہ بار بار لوگوں کی بے عقلی اور بدنظمی پر، سپاہیوں کی ظالمانہ حرکتوں پر، ریاست کی بے انتظامی پر چڑتا ہے۔ اس کے اندر ایک انقلابی، ایک باغی کی روح پکارتی ہے۔ وہ جب سپاہ کی شان وشوکت اور کثرت کا حال بیان کرتا ہے تو ان محتاجوں اور فقیروں کو بھی یاد کرتا ہے جو نانِ شبینہ کے لیے ترس رہے تھے۔ کبھی کبھی تو موسم کے شدائد کا حال بھی اس انداز سے رقم کرتا ہے کہ عبرت کا سامان بن جاتا ہے۔

یہ سفرنامہ ہندوستان کے طول وعرض میں جاری وساری صورت حال کے ادراک اور اس کے کثیر الجہت پہلوؤں کے مطالعے کا بہترین اور بنیادی ماخذ ہے۔ خاص طور پر اودھ کی ریاست کے درباری ماحول سے دور، مفلس دیہاتیوں کی بیچارگی اور بے بسی کی تصویر دکھاتا ہے اور ریاستی عملداری کے غیر مؤثر ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اس بدانتظامی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے داروں نے سازشوں، ریشہ دوانیوں اور مکر وفریب کا ایسا جال بچھا رکھا تھا جس میں الجھ کر حکمران اپنی رعایا کی فلاح وبہبود سے بے خبر ہو گئے تھے۔ اس بات میں بھی صداقت ہو گی لیکن اس کے باوجود ہندوستانی حکمرانوں کو اس زوال کی ذمہ داری سے بری نہیں رکھا جا سکتا جن کی ترجیحات میں اولیت اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کر گزرنے کی عادت کو حاصل تھی۔ عیش وعشرت اور ''انتظامی بداخلاقی'' اپنے عروج پر تھی۔ منصوبہ بندی کا فقدان، وقتی اور

ہنگامی ضروریات کے تحت فیصلہ سازی کا عمل اور گہری بصیرت وحکمت کا فقدان بھی اس زوال کا اتنا ہی ذمہ دار ہے۔ان حکمرانوں میں محض اودھ ہی نہیں، دیگر ریاستوں کے حکمران بھی، بلاتمیز مذہب ومسلک، برابر کے شریک رہے ہیں۔اس سفرنامے کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہندوستان کی غلامی کی ذمہ داری صرف نوآبادیاتی طاقتوں ہی پر ڈال دینا کافی نہیں۔خود ان نوآبادیات کے عوام کو بھی اب اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ کرنا ہوگا اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان جیسے ممالک میں سماجی نظام کی حد تک معاملات بہتر ہونے کی بجائے روبہ زوال ہیں۔ماضی کی صورت حال کو سمجھ کر حال اور آئندہ کی منصوبہ بندی میں مدد مل سکتی ہے۔

لسانی اعتبار سے بھی اس سفرنامے کا مطالعہ اردو زبان کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔یہ وہ دور تھا جب اردو زبان کی معیار بندی کا کام بالکل ابتدائی مراحل میں تھا اور یہ کام بھی غالب قوم یعنی انگریزوں کے ہاتھوں ہی ہو رہا تھا۔عوام علمی وادبی زبان کے طور پر ابھی تک فارسی سے مانوس تھے۔تاہم اردو کا چلن تیزی سے عام ہو رہا تھا۔کمبل پوش نے اس سفرنامے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ انیسویں صدی کے طرز املا وانشا کے مطابق ہے۔اس املا کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

الف۔دو یا زیادہ الفاظ کو ملا کر لکھنا، جیسے: انسانکو (انسان کو)، فتحعلیخان (فتح علی خان)، فوجونکے (فوجوں کے)، اوسوقت (اوس وقت)

ب۔یائے معروف ومجہول میں تمیز نہ ہونا، جیسے: ہونی لگی (ہونے لگے)، گئی (گئے)، کیی (کیے)، سرای (سرائے)

ج۔ہائے مخلوط (دوچشمی ھ) کی جگہ ہائے کہنی دار کا استعمال، جیسے: گہوڑا (گھوڑا)، کوٹہی (کوٹھی)، مجہکو (مجھکو)۔

د۔املا کا قدیم انداز جو اب متروک ہو چکا ہے، جیسے تیار کو طیار، مع کو معہ، کوچ کو کونچ، فائر کو فر، گڑھی کو گڈہی، پہنچا کو پونچہا، چپیا کو چپیلہ، بارود کو باروت، کھانے کو گھانے، ان کو، اس کو، اس نے کی بجائے اونکو، اوسکو، اوسنے وغیرہ۔اسی طرح جملوں کے درمیان ''اور'' کے لیے ''و'' کا استعمال، لیکن کی بجائے لاکن، ہوا کو ہویا اور برائے کو بنابر لکھنا عام تھا۔

رنحوی ساخت میں یکسانی اورقواعد وضوابط سے انحراف ،جس کے نتیجے میں پیچیدہ جملےنظر آتے ہیں مثلاً: ''بسبب آمد جناب لاٹ صاحب بہادر،طیاری سڑکوں کی لکھنؤ سے تا بہ کان پورمعرفت راجا غالب جنگ بہادر کی کہ وہ خود مع خیمہ وقنات فروکش تھے،درستی ہورہی تھی''۔

اسلوب کے اعتبار سے سفرنامہ کسی نمایاں مقام کا حامل نہیں۔بیشتر مقامات پر تو تحریر کا انداز محض بیانیہ ہے لیکن کہیں کہیں خوش مزاجی اور شگفتگی لطف دیتی ہے۔البتہ غالب انداز طنزیہ واستہزائیہ ہے۔کہیں کہیں فلسفیانہ خیالات کا اظہار بھی ملتا ہے:

> ''خیال کیا میں نے کہ جو شخص ہے سوآفات دنیوی میں گرفتار،طمع دنیا کو چھوڑا نہیں جاتا ہے اور ہرروز زیادہ طلبی میں اوقات اپنی کوتلف کررہا ہے۔افسوس صد افسوس انسان اگر خیال کرے تو کچھ بھی نہیں ، فقط معما معلوم ہوتا ہے۔مثل خواب کے ہے کہ دیکھنے اپنے کو بادشاہ خواب میں اور ہے بہت محتاج ۔جس وقت آنکھ کھل گئی ، دیکھا کچھ بھی نہیں ۔نہ تخت ہے نہ تاج شاہی ، نہ ملک ہے،فقط اب تن تنہا، اورغلبہ بھوک کا ہے۔لاچار اٹھ کرگیا اور کے گھر، مانگ کے لایا تب نوش کیا۔اس وقت ہوش وحواس درست ہوئے ۔تب یقین آیا کہ خواب ہے۔ کچھ نہیں۔یہی حال اس دارنا پائیدار کا ہے''۔

اس سفرنامے کی زبان وبیان کا موازنہ تاریخ یوسفی سے کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔پہلی کتاب کے مسودے کو چھپنے سے پہلے یقیناً خود مصنف نے اور شاید کسی اور نے بھی چھان پھٹک کر، خوب سنوارا ہوگا۔لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا قلمی نسخہ مصنف نے خود پہلی بار لکھا ہو اور ابھی اس کی تراش خراش کا عمل باقی ہو۔تحریر کہیں کہیں بے ربط ہوجاتی ہے۔کئی مقامات پر الفاظ مکرر لکھے گئے ہیں، املا میں بھی یکسانی نہیں ہے۔تاریخ یوسفی کی نسبت اس تحریر میں، چند ایک اقتباسات کے علاوہ، زبان کی چاشنی نہیں ملتی لہٰذا ادبی اعتبار سے اس نسخے میں خامۂ غالب کی سی معجز بیانی تلاش کرنا عبث ہے۔یہ کسی شاعر یا ادیب کی تحریر نہیں، ایک من موجی فوجی افسر کا

بیانیہ ہے۔ اس تحریر کا بنیادی مقصد لذت کلام نہیں، ترسیلِ معلومات اور اظہارِ خیالات ہے۔ مصنف اپنے قلب ونظر کی وارداتوں میں کسی کو شریک کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب رہا ہے۔ اس سفرنامے کی ادبی اہمیت تو محض تاریخی ہی ہوگی، لیکن اس کی معاشرتی اور تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) رابرٹ کیتھ پرنگل نوآبادیاتی عہد کی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے ۱۸۲۰ میں بمبئی سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ سندھ میں سر چارلس نیپئر کے جانشین ہوئے اور ۱۸۵۴ میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ بک لینڈ (Buckland) Dictionary of Indian Biography (لندن: ۱۹۰۵ء)، ص ۳۴۳

(۲) انیسویں صدی میں اس کتاب کے عجائباتِ فرنگ کے عنوان سے دو ایڈیشن شائع ہوئے (منشی نول کشور، ۱۸۷۳ء، ۱۸۹۸ء)۔ بیسویں صدی میں دو محققین، ڈاکٹر مظفر عباس (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۲ء) اور پروفیسر تحسین فراقی ((لاہور: مکہ بکس، ۱۹۸۳ء) نے اس کے متن پر حواشی اور مقدمے لکھ کر اسے از سر نو مرتب کیا اور اس کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ بھی کیا۔ اکیسویں صدی میں اکرام چغتائی نے اس کتاب کو اس کے اصل نام یعنی ''تاریخ یوسفی'' (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) کے تحت از سر نو مرتب کیا اور اس کے اولین ایڈیشن (دہلی: ۱۸۴۷ء) کا عکسی نقل بھی شائع کیا۔

(۳) محمد اکرام چغتائی، پیش لفظ، تاریخِ یوسفی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۱۔

(۴) اس سفرنامے کا ذکر جن اہم انگریزی کتابوں میں ہوا ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:
مائیکل ایچ۔ فشر (Michael H. Fisher)، Counterflows to Colonialism: Indian Travellers and Settlers in Britian 1600-1857 (دہلی: پرمننٹ بلیک (Permanent Black)، ۲۰۰۴)، گلفشاں خان، Idian Muslims Perceptios of the West durig the Eighteenth Century (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء)، لویلین جونز (Llewellyn-Jones, Rosie)، Engaging Scoundrels: True Tales of Old Lucknow (نئی دہلی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰)

(۵) یوسف خان کمبل پوش، تاریخ یوسفی، مرتبہ محمد اکرام چغتائی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۵۳

(۶) سید محسن علی، سراپا سخن (لکھنؤ: نول کشور، ۱۸۷۵ء)، ص ۸۲ بحوالہ تحسین فراقی، مقدمہ عجائبات فرنگ (لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۸۳ء)، ص ۵۶۔

(۷) تحسین فراقی، ص ۵۱۔ (۸) مائیکل ایچ فشر، ص ۳۰۹۔

(۹) روزی لویلن جونز (Rosie Llewellyn-Jones)، "Indian Visitors to England"، مشمولہ *Engaging Scoundrels: True Tales of Old Lucknow*، ص ۸۶۔۱۲۴

(۱۰) ایضاً، ص ۹۹۔

(۱۱) روزی لویلن جونز نے پہلی طباعت کا عنوان ''سفر یوسف'' تحریر کیا ہے، جو درست نہیں مگر محمد اکرام چغتائی صاحب کی تحقیق کے مطابق اس دور کے اخبارات و جرائد میں اس کتاب کا ذکر مختلف ناموں ہوتا رہا، جیسے سیر کمبل پوش یا سیر یوسفی وغیرہ۔ چغتائی، پیش لفظ، تاریخ یوسفی، ص ۱۱۔

(۱۲) روزی لویلن جونز (Rosie Llewellyn-Jones)، ص ۹۹۔

(۱۳) گارسیں دتاسی، خطبات گارسیں دتاسی از ۱۸۵۰۔۱۸۶۹ء (دکن: انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)، ص ۳۱۸۔۳۱۹۔

(۱۴) انڈین میل کا پرچہ، ۲۳ ستمبر ۱۸۶۱ء کا یہ شمارہ برٹش لائبریری لندن میں موجود ہے اور اس کا متعلقہ اقتباس چغتائی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں نقل کر دیا ہے۔ دیکھیے، چغتائی، پیش لفظ، تاریخ یوسفی، ص ۴۲۔۴۴

(۱۵) ان کے معاصر تذکرہ نگاروں میں سے عبدالغفور نساخ اور سید محسن علی نے انھیں آتش کا شاگرد قرار دیا ہے لیکن راقم الحروف کو اسی لائبریری سے لکھنؤ کے شعرا کا ایک تذکرہ ملا ہے جو ۱۸۵۶ اور ۱۸۸۷ء کے درمیانی دور میں لکھا گیا ہے اور اس میں کمبل پوش کا ذکر نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں شاعر کے طور پر زیادہ معروف نہیں تھے۔ محسن نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں یہ مجمل معلومات فراہم کی ہیں: ''یوسف خان ولد رحمت خان غوری باشندۂ لکھنؤ۔ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔'' (محسن، ص ۸۲) ناصر نے بھی صرف اتنا لکھا ہے: ''خوش تقریر، شیریں بیان، یوسف خان یوسف، شاگرد آتش''، بحوالہ محمد انصار اللہ، مرتب جامع التذکرہ، جلد سوم (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷ء)، ص ۹۳۱۔

(۱۶) تحسین فراقی، ص ۴۹۔

(۱۷) محمد اکرام چغتائی، ص ۴۸۔

(۱۸) ایشیاٹک جرنل اینڈ رجسٹر (دسمبر ۱۸۳۸ء)، ایشیاٹک انٹیلی جنس، ص ۲۶۸۔

(Gyananneshun, July 25. Asiatic Journal and register)
(December 1838), Asiatic Intelligence, 268

(۱۹) کمبل پوش، تاریخ یوسفی، مرتبہ محمد اکرام چغتائی، ص۱۷۹

(۲۰) ایضاً، ص۱۷۵

(۲۱) تاریخ یوسفی میں کمبل پوش نے اسے کپتان مکلاس لکھا ہے اور یہی املا محمد اکرام چغتائی نے بھی اختیار کیا ہے۔ لوویلین جونز نے کپتان مکلاس کے لقب (یا خطاب) ممتاز خان سے دھوکا کھا کر اسے ممتاز خان انگلش لکھا ہے جو درست نہیں۔ لوویلین جونز، ص۱۰۰

(۲۲) کمبل پوش، تاریخ یوسفی، ص۵۳۔

(۲۳) لوویلین جونز، ص۸۶۔

(۲۴) ڈبلیو۔ایچ۔سلیمن (W.H. Sleeman)، "A Journey Through the Kingdome of Oude" حصہ اول ودوم (نئی دہلی، چنائے: ایشین ایجوکیشن سروسز، ۲۰۰۶ء)۔

(۲۵) ولیم نائٹن (William Knighton)، The Private Life of an Eastern King Together with Elihu Jan's Story or the Private Life of an Eastern Queen (لندن: ۱۸۵۵ء)

(۲۶) تفصیل کے لیے دیکھیے، مسیح الدین علوی، سفیر اودھ (لکھنؤ: دارالناظر پریس، ۱۹۲۹ء) اور عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، مرتب محمد اکرام چغتائی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)۔

(۲۷) مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر، Oudh: Its Princes and Its Government Vindicated (لندن: جون ڈیوی اینڈ سنز، ۱۸۵۷ء)، اشاعت ثانی، صفی احمد، مرتب، British Aggression in Awadh (میرٹھ: ۱۹۶۹ء)۔

(۲۸) کمبل پوش، تاریخ یوسفی، ص۵۳۔

(۲۹) تفصیل کے لیے دیکھیے: http://www.civitas.org.uk/pdf/Tocqueville_rr2.pdf اور http://www.jstor.org/discover/10.2307/1404731?uid=2&uid=4&sid=21102887092081

(۳۰) محمد اکرام چغتائی، ص۲۱۔۲۸۔